منصور اصغر راجہ　　(آخری قسط)

سابق قادیانی مربی محمد نذیر کی کہانی ـــــ ان کی اپنی زبانی

دورِ طالب علمی میں جب جامعہ احمدیہ میں ہمارے ہم جماعت ساتھی، سعید نے جامعہ کے پرنسپل پر جنسی تشدد کا الزام لگایا تو ہم نے سعید کو جی بھر کے گالیاں دی تھیں۔ فیلڈ میں آنے کے بعد بھی اس طرح کے کچھ واقعات میرے علم میں آئے، لیکن میں انہیں اکا دکا لوگوں کا ذاتی فعل سمجھتا رہا۔ تاہم جب میں جماعت کے اعلیٰ حلقوں کے قریب ہوا تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اخلاقی گراوٹ اور پستی کے ایسے ایسے واقعات سامنے آئے کہ عقل دنگ رہ گئی۔ ظاہری طور پر جو لوگ ہمیں فرشتوں سے بھی افضل نظر آتے تھے، باطنی طور پر وہ ابلیس کو بھی مات دیتے دکھائی دیئے۔ مرزا خلیل قمر چناب نگر کی مشہور علمی شخصیت ہیں۔ قادیانی خواتین کی اصلاح و تربیت کے لیے چھپنے والے جماعت احمدیہ کے رسالے ''مصباح'' کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کے علم و فضل کے بارے میں ایک بار خلیفہ رابع، مرزا طاہر نے کہا تھا کہ اگر کتابوں سے بھرے ہوئے پانچ سوٹرک ایک طرف ہوں اور مرزا خلیل قمر دوسری طرف، تو مرزا خلیل قمر کا پلڑا بھاری ہوگا۔ ''انصار اللہ'' کی تاریخ بھی انہی صاحب نے لکھی۔ لیکن اس عالم فاضل شخص کا اپنا کردار یہ ہے کہ اخلاقی بے راہروی موصوف کا من پسند مشغلہ ہے۔ اسی عادتِ بد کے ہاتھوں ایک دفعہ بہت بُرے پھنسے بھی تھے۔ یہ 2007ء کی بات ہے کہ انہوں نے ایک لڑکے سے زیادتی کی۔ متاثرہ لڑکے کے اہل خانہ پولیس کے پاس پہنچ گئے۔ مرزا خلیل نے جب بات بگڑتی دیکھی تو متاثرہ فریق کو ایک لاکھ 65 ہزار روپے دے کر راضی نامہ کر لیا۔ ان میں سے 65 ہزار روپے الائیڈ بینک چناب نگر برانچ کے اکاؤنٹ سے ٹرانسفر کئے گئے اور باقی رقم نقد ادا کی گئی۔ راضی نامے کا اسٹامپ پیپر دو گواہوں کے روبرو لکھا گیا جو اب بھی محفوظ پڑا ہے۔ اگر مرزا خلیل قمر پسند فرمائیں تو وہ ان کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ محمد بخش صادق جماعت احمدیہ کے سابق امیر اعلیٰ پاکستان ہیں۔ ان کے پاس جماعت کی کئی ذمہ داریاں ہیں۔ ناظم وقف جدید، ناظم تحریک جدید، ناظم خدمت درویشاں کے علاوہ جماعت احمدیہ کینیڈا کے امیر بھی رہے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں سے اپنی ٹانگیں دبوانا، نوعمر لڑکوں سے زیادتی اور جماعتی اثاثوں کا بے دریغ ناجائز استعمال ان کے خاص شوق ہیں۔ سابق مینیجر یو بی ایل نسیم سیفی گزشتہ بیس سال سے چناب نگر کے محلّہ دارالرحمت غربی کے صدر ہیں۔ وہ مالی تعاون کے بدلے غریب خواتین کے استحصال کا کوئی موقعہ ضائع جانے نہیں دیتے۔ سید مبارک شاہ بھی جماعت کے بڑے بااثر اور مرکزی مبلغ ہیں۔ یہ سندھ میں میرے پیشرو تھے۔ جب میری وہاں پوسٹنگ ہوئی تو میں نے انہی سے چارج لیا تھا۔ جماعت کے اندرونی حلقوں میں موصوف کو کرپشن کا بادشاہ اور جعلی بیعت کرانے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ جھنگ کے رہائشی ڈاکٹر اللہ بخش صادق آج کل چناب نگر کی کالونی ''بیت الحمد'' میں رہتے ہیں۔ اندرون سندھ اپنی تعیناتی کے دوران انہوں نے کئی ہندو لڑکیوں کی عزت لُوٹی۔ احسان اللہ چیمہ جماعت احمدیہ صوبہ سندھ کے ناظم ہیں۔ خالد محمود سندھو ایک سپیشلسٹ مربی ہیں جنہوں نے جامعہ احمدیہ چناب نگر سے سات سالہ ''شاہد'' کورس کیا ہوا ہے۔ خالد سندھو اور احسان چیمہ جامعہ میں کلاس فیلو اور گہرے دوست تھے۔ احسان چیمہ کی جب منگنی ہوئی تو وہ اپنی منگیتر سے ملنے کبھی کبھی اپنے سسرال جایا کرتے، تو خالد سندھو

بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ دونوں بھی پرلے درجے کے بدقماش ہیں۔ اس طرح کے کئی واقعات جب میرے علم میں آئے تو میرے دل میں قائم تقدیس، تکریم اور عقیدت کا تاج محل مسمار ہونے لگا۔ لیکن مولوی محمد دین کے بارے میں انکشافات اندھی عقیدت کے اس تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔ مولوی محمد دین جماعت احمدیہ کے خلیفہ رابع مرزا طاہر کے استاد ہیں۔ موصوف بھی ایک عادتِ بد میں مبتلا ہیں۔ ان سے ''مستفید'' ہونے والوں میں احسن گوندل، افتخار شاکر، عبد الحفیظ، نوید اور محسن گلو کا نام زیادہ آتا ہے۔ میں اس ساری صورتحال سے اس قدر بددل ہوا کہ میں نے 2003ء میں ان تمام واقعات کے تذکرے پر مبنی آٹھ صفحات پر مشتمل ایک خط اُس وقت کے امیر جماعت احمدیہ پاکستان، مرزا خورشید کو بذریعہ ٹی سی ایس ارسال کیا۔ لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ پندرہ یوم تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں نے ان سے فون پر رابطہ کیا اور اپنے خط کے بارے میں پوچھا کہ کیا ان افراد کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ تو انہوں نے جواباً کہا کہ ''آپ ایک پاگل انسان ہو، اس لیے آپ کے خط پر کسی قسم کا عمل نہیں ہوسکتا''۔ امیر جماعت کا یہ جواب سننے کے بعد میں نے جماعت سے علیحدگی کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔

مجھے بچپن سے ہی سکن الرجی تھی۔ جسم پر خارش کی وجہ سے میں ہر وقت پریشان رہتا۔ بہت علاج کرایا۔ بڑی مہنگی دوائیں اور کریمیں استعمال کیں لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ اسلامیہ ہائی سکول جھنگ میں ہمارے ایک استاد ماسٹر عبدالحق صاحب ہوا کرتے تھے جو ہمیں دسویں جماعت میں پڑھایا کرتے تھے۔ متقی مسلمان ہیں اور ماشاءاللہ ابھی بھی بقید حیات ہیں۔ مجھے ان سے بہت انسیت ہے۔ میں جب بھی جھنگ جاتا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ وہ میرے خاندانی و مذہبی پس منظر سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود میرے ساتھ بے حد محبت کرتے ہیں۔ جن دنوں میں جماعت سے علیحدگی کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ایک روز ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دوران گفتگو میں نے اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے ان سے دعا کے لیے درخواست کی تو فرمانے لگے کہ ''میں تمہارے لیے دعا تو ضرور کروں گا لیکن تم ایک کام کرو۔ چالیس روز تک روزانہ ہر رات اپنی عبادتگاہ میں کچھ وقت اللہ کی یاد میں گزارا کرو اور اس دوران اللہ سے یہ التجا کیا کرو کہ اے میرے رب، اگر تُو نے مجھے اس بیماری سے شفاء دے دی تو میں مرتے دم تک تیرا فرمانبردار بن کر رہوں گا''۔ میں نے ماسٹر صاحب کی اس ہدایت پر عمل شروع کر دیا۔ ان دنوں میں ذہنی طور پر پریشان ہونے کی وجہ سے ویسے بھی تنہائی کی تلاش میں رہتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے تیس روز گزر چکے تھے۔ اُس رات میں منڈی بہاءالدین کے موضع ''رجوعہ'' میں ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ حسب معمول رات کے وقت عبادتگاہ میں بیٹھا تھا کہ بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے کوڑھ ہو گیا ہے، میرا سارا جسم گل سڑ رہا ہے اور اپنی اس حالت کی وجہ سے میں زاروقطار رو رہا ہوں۔ اتنے میں خواب میں ہی مجھے ایک انتہائی پُرنور باریش چہرہ نظر آیا۔ ایسا حسین و جمیل چہرہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ اس شخصیت نے مجھ سے پوچھا کہ آپ رو کیوں رہے ہو۔ میں نے روتے ہوئے جواباً عرض کیا کہ میری جو حالت ہے، کیا یہ ہنسنے کے قابل ہے؟۔۔۔ میرا جواب سن کر اس چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ جگمگائی اور پھر انہوں نے میرے سر پر اپنا ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے کہا کہ ''تمہاری بیماری ختم ہو جائے گی۔ آئندہ کوئی دوائی استعمال

نہ کرنا اور اب فرمانبردار ہو جاؤ''۔اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا کہ اب مجھے تائب ہو جانا چاہئے۔مزے کی بات یہ ہے کہ وہ دن اور آج کا دن، مجھے دوبارہ کبھی بھی خارش کی تکلیف نہیں ہوئی۔میں نے تمام دوائیں اور کریمیں پھینک دیں۔اب کبھی سکن الرجی کیلئے دوا استعمال نہیں کی۔یہ 2006ء کی بات ہے۔

جب جماعت کے کچھ سرکردہ لوگوں کی اخلاقیات سے گری ہوئی حرکتوں کے متعلق میرے خط کے جواب میں امیر جماعت احمدیہ پاکستان مرزا خورشید نے مجھے پاگل قرار دیا تو یہ بات میرے لیے کسی شاک سے کم نہ تھی۔میں کئی روز تک اس صدمے سے باہر نہ نکل سکا کیونکہ اپنی بہترین کارکردگی کی وجہ سے میں جماعت کے اعلیٰ ترین حلقوں میں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔مجھ پر جماعتی قیادت کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ سابق وزیراعلیٰ پنجاب میاں منظور وٹو کے والد نے فضل عمر ہسپتال چناب نگر میں جب زندگی کی آخری سانس لی تو اُس وقت ان کا سر میری گود میں تھا کیونکہ وہ جتنے دن ہسپتال میں زیر علاج رہے،ان کی دیکھ بھال اور خدمت کے لیے جماعت نے مجھے ان کے ساتھ متعین کیے رکھا۔سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر جب ابھی گورنر نہیں بنے تھے،اس وقت بھی جماعت کے اعلیٰ سطحی وفود مختلف درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کے لیے اکثر ان سے ملاقاتیں کیا کرتے۔اور سلمان تاثیر ان مسائل کے حل کے لیے جماعت کی ہر طرح سے معاونت کیا کرتے تھے۔اس طرح کے کئی وفود میں، میں بھی شامل رہا اور مجھے متعدد بار سلمان تاثیر سے ملاقات اور ان کے ساتھ کھانا کھانے کا موقعہ ملا۔لیکن آج جب میں نے کچھ لوگوں کی اخلاقی گراوٹ کی طرف انگلی اٹھائی تو جماعتی قیادت کی نظر میں پاگل ٹھہرا۔اس صورتحال کی وجہ سے اپنے کام سے میرا دل اچاٹ ہو گیا اور میں خود کو جماعت چھوڑنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔اس بات کا تو مجھے بھی یقین تھا کہ اگر جماعت کا امیر ہی میری بات پر توجہ نہیں دے رہا تو ایک عام قادیانی میری بات پر کیسے یقین کرے گا۔اس لئے میں نے مربی کی ذمہ داری سے جان چھڑانے کے لئے بھی سوچ بچار شروع کر دی۔اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ جماعت سے تین سال کی رخصت مانگی جو Without Pay کی شرط کے ساتھ منظور کر لی گئی۔چھٹی منظور ہوتے ہی میں نجی دورے پر ملائشیا چلا گیا۔اور پھر 2003ء سے 2005ء تک میں ملائشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور سری لنکا میں رہا۔اس دوران زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے مختلف مزدوریاں بھی کیں۔اصولاً بیرون ملک سے واپسی کے بعد مجھے دوبارہ مربی کی ڈیوٹی جوائن کرنی چاہئے تھی لیکن میں چونکہ یہ کام چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا،اس لئے اپنی ڈیوٹی پر واپس جانے کی بجائے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔چند روز بعد ہی مجھے ہومیو پیتھک ادویات کی ڈسٹری بیوشن کمپنی ''کیوریٹو ہومیو پیتھک'' میں جاب مل گئی جس کے مالک موجودہ ناظر امور عامہ سلیم الدین کے برادر نسبتی راجہ رشید احمد رشدی ہیں۔یہ صاحب اپنے آپ کو رشدی کہلوا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔میں نے یہاں کام شروع کر دیا اور دوسری طرف جماعت نے ڈیوٹی پر واپس پہنچنے کا تقاضا شروع کر دیا۔اس سلسلے میں مجھے جماعت کی طرف سے متعدد بار تنبیہہ بھی کی گئی اور بطور مربی کام کرنے کا حکم دیا گیا۔لیکن جب میری طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملا تو جماعت نے مجھے مربی کی ذمہ داری سے فارغ کرتے ہوئے تمام میڈیکل کارڈز، پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات مجھ سے واپس لے لئے۔اس کے ساتھ ہی ''کیوریٹو ہومیو پیتھک'' کی نوکری سے بھی مجھے جواب مل گیا۔اب حالت یہ ہو گئی کہ نئی نکور لینڈ کروزر پر گھومنے والا نذیر اپنا گھر چلانے کے لئے رکشہ چلانے پر مجبور ہو گیا۔لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ سوچ سوچ کر

خوش ہوتا رہا کہ میں تو جماعت اور مربی کی ذمہ داری سے الگ ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا، چلو اچھا ہوا کہ جماعت نے خود ہی میری جان چھوڑ دی۔ لیکن یہ میری خوش فہمی تھی کیونکہ جماعت احمدیہ تو قیادت سے اختلاف رائے کی جرات کرنے والے کسی عام قادیانی کو معاف نہیں کرتی، یہاں تو لاکھوں روپے صرف کر کے تیار کیا جانے والا ایک مربی جماعت سے بغاوت کی جرات کر رہا تھا، جماعت اسے ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کر لیتی۔

چونکہ میں کاروباری ذہن کا مالک ہوں، اس لئے چند روز اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی مزدوری کرنے کے بعد میں نے کوئی کاروبار کرنے کا سوچا۔ اب میں ایسا کاروبار تو کر نہیں سکتا تھا کہ جس کے لئے بھاری سرمایہ انویسٹ کرنا پڑے کہ سرمایہ کہاں سے لاتا۔ البتہ بات کرنے کا سلیقہ بھی تھا اور خوش اخلاقی کا دس سالہ تجربہ بھی تھا، میں نے ان دونوں صلاحیتوں سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور چنیوٹ میں بطور مڈل مین گنے کی ٹھیکیداری شروع کر دی۔ اللہ نے برکت دی اور میرا کام چل نکلا۔ اسی دوران میرے اندر ایک اور تبدیلی بھی آئی۔ اگرچہ میں سکن الرجی سے شفایابی والا خواب دیکھنے کے بعد دل سے اسلام کی حقانیت پر ایمان لا چکا تھا لیکن ابھی علی الاعلان قادیانیت سے تائب نہیں ہوا تھا۔ البتہ جماعت سے میں نے عملاً علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ چناب نگر میں رہتے ہوئے بھی نہ تو میں جماعت کی مذہبی تقریبات میں شرکت کرتا اور نہ ہی جماعت کو چندہ دیتا۔ علاقے کے مسلمانوں کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ ہو گیا۔ بلکہ میں اکثر ان کی مسجد میں بھی چلا جاتا۔ جماعت میری سرگرمیوں کو واچ کر رہی تھی جس کا پتہ مجھے ایسے چلا کہ جب ایک روز مجھے صدر دفتر عمومی طلب کر کے کہا گیا کہ ''آپ کی حرکات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ اس پر توجہ دیں ورنہ آپ کو اس کے سنگین نتائج بھگتنا پڑ سکتے ہیں''۔ میں نے اس دھمکی کا جواب اس طرح دیا کہ چناب نگر والا گھر چھوڑ کر قریبی پہاڑی کے دامن میں سرکاری اراضی پر ایک کچا کمرہ بنایا اور بیوی کے ہمراہ وہاں رہنے لگا اور پوری توجہ اپنے کاروبار پر مرکوز کر دی۔

وہ 7 جنوری 2007ء کی صبح تھی۔ گھڑی غالباً سات بج کر چالیس منٹ بجا رہی تھی۔ میں اپنی چھ سالہ بیٹی عروسہ نذیر کو راجیکی روڈ پر واقع اس کے سکول ''ٹوئنکل سٹار اکیڈمی'' چھوڑنے کے لئے گھر سے نکلا۔ ہم باپ بیٹی موٹر سائیکل پر جا رہے تھے، جب راجیکی روڈ پر چڑھے تو پیچھے سے آنے والی ایک 86 ماڈل کرولا کار میں سے کسی نے آواز دی ''ٹھیکیدار صاحب ذرا رکنا''۔ میں یہ سمجھا کہ شاید کوئی مقامی زمیندار ہے جو گنے کی فصل کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے موٹر سائیکل روک لی۔ میرے رکتے ہی کار میں سے تین نامعلوم مسلح افراد نکلے۔ انہوں نے مجھ سے میری بیٹی اور موٹر سائیکل چھینی، میری جیب میں موجود تین ہزار روپے نکالے اور چلتے بنے۔ میں نے تھانہ چناب نگر اطلاع دی تو پولیس نے بچی کی بازیابی کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ چند روز گزر گئے لیکن بچی نہ مل سکی۔ اسی دوران نامعلوم نمبرز سے مجھے کالیں آنے لگیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کی کال اُس وقت آتی جب میں تھانے آتا۔ تھانے سے باہر نکلتے ہی میرا موبائل فون بجنے لگتا اور کسی نامعلوم نمبر سے کال کرنے والا شخص مجھے کہتا ''تھانے سے ہو آئے ہو، اچھی بات ہے لیکن کیا اس طرح تمہیں تمہاری بیٹی مل جائے گی۔ تم نے بہت کاروبار کر لیا ہے۔ اب اگر اپنی بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس میں سے ہمارا بھی کچھ حصہ نکالو''۔ وہ لوگ چند روز تک اسی طرح میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے اور پھر ایک روز انہوں نے مجھ سے بیٹی کے بدلے

50لاکھ روپے تاوان مانگ لیا۔میرے منت سماجت کرنے پر 20لاکھ روپے میں معاملہ طے ہوا۔لیکن میرے لئے یہ بھی بہت بڑی رقم تھی۔میں اتنے پیسے کہاں سے لاتا۔چونکہ گنے کا سیزن چل رہا تھا۔کئی زمینداروں کے بل میرے پاس پڑے تھے۔میں نے انہیں منت سماجت کر کے اس بات پر راضی کیا کہ اگر وہ مجھے اپنی رقم استعمال کرنے کی اجازت دیں تو انہیں میں چند روز ٹھہر کر ادائیگی کر دوں گا۔کچھ قریبی دوستوں سے ادھار پیسے پکڑے اور اس طرح کر کرا کے 20لاکھ روپے جمع کئے۔اغوا کاروں نے تاوان کی ادائیگی کے لئے مجھے رات ایک بجے فیصل آباد کے علاقے ستیانہ بنگلہ میں جھامرہ روڈ پر واقع چک نمبر 238 گ ب شیر کا، کے قریب سے گزرنے والی نہر کے پُل پر بلایا۔تاوان وصول کرنے کے بعد انہوں نے مجھے کہا کہ اگلے روز دوپہر کے وقت چناب نگر ریلوے سٹیشن پر آنے والی ایک ٹرین کے ڈبے سے مجھے میری بیٹی مل جائے گی۔اگلے روز ایسا ہی ہوا اور چھ روز بعد مجھے میری بیٹی مل گئی۔بچی بازیاب ہوتے ہی چناب نگر کی پولیس حرکت میں آئی اور مجھے میرے گھر سے اٹھا کر تھانہ چناب نگر کی حوالات میں بند کر دیا۔مجھ پر میری ہی بیٹی کو اغوا کرانے کا الزام تھا۔اُس روز پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ جماعت نے مجھے سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب آزمائش کا دور شروع ہونے والا ہے۔

بیٹی کی بازیابی کے بعد اگلے تین روز تک مجھے دفتر عمومی بلوایا جاتا رہا جہاں دفتر عمومی کا کارِ خاص ناصر بلوچ مجھے یہ دھمکی آمیز پیغام دیتا کہ ''آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اب بھی وقت ہے کہ تم سُدھر جاؤ۔'' لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی تین روزہ ''نصیحت'' کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔تو اگلے ہی روز مجھے اپنے گھر سے اٹھا کر تھانہ چناب نگر کی حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ساری شام اسی اُدھیر بن میں گزری کہ مجھے کس الزام کے تحت یہاں لایا گیا ہے۔جب گھڑی نے رات کے گیارہ بجائے تو ایک اہلکار مجھے حوالات سے نکال کر تھانے کے ایک الگ کمرے میں لے گیا۔کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے دیکھا کہ صدر دفتر عمومی اللہ بخش صادق، قادیانی نواز ڈی ایس پی سعید اختر قتلہ، مقامی ایس ایچ او یاسر پنسوتہ، چوکی انچارج چوہدری اصغر، صدر محلّہ باب الابواب نذیر احمد شیشے والا اور ناصر بلوچ سامنے ہی ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ان لوگوں نے مجھ سے یہ مطالبہ کیا کہ میں تحریری طور پر یہ الزام قبول کروں کہ میری بیٹی کا اغوا ایک خود ساختہ ڈرامہ تھا اور میں نے اسے خود اغوا کرایا تھا۔میں نے یہ سب لکھ کر دینے سے انکار کر دیا۔میرا انکار سنتے ہی میرے اردگرد کھڑے پولیس اہلکار مجھ پر پل پڑے۔انہوں نے مجھے مکمل طور پر برہنہ کرنے کے بعد اُلٹا لٹایا اور چھترول شروع کر دی۔ایک اہلکار با آواز بلند گنتی کر رہا تھا اور باقی مجھے مار رہے تھے۔انہوں نے گن کر مجھے 100لٹر مارے۔40کے بعد میں درد اور تکلیف سے قدرے بے نیاز ہو گیا۔گنتی پوری ہونے کے بعد انہوں نے مجھے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اٹھایا اور لا کر حوالات میں پھینک دیا۔میری حالت دیکھ کر وہاں بند دیگر حوالاتی بھی سہم گئے۔ہمارے علاقے کا نامی گرامی چور ''یارو موچی'' بھی اس وقت حوالات میں بند تھا۔اس نے میرا سارا جسم دبایا، سنتری سے کہہ سن کر تھوڑا سا تیل منگوایا اور مجھے مالش کی۔دو ڈھائی گھنٹے بعد میرے حواس بحال ہوئے اور میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوا۔لیکن یہ تو ابھی ابتدا تھی۔مجھے چار روز تک حوالات میں بند رکھا گیا۔اس دوران پولیس نے مجھ پر تشدد کا ہر ہر حربہ آزمایا۔وہ بار بار مجھے منجی (چارپائی) پر چڑھاتے تھے۔چارپائی الٹی کر کے وہ میرے ہاتھ پاؤں چاروں پایوں کے ساتھ باندھ کر چارپائی سیدھی کر دیتے۔ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے سارا زور میرے جسم پر پڑتا تو مجھے ایسے لگتا کہ میرے جسم کا ایک ایک جوڑ الگ ہو رہا

ہے۔ یہ اس قدر تکلیف دہ عمل تھا کہ میں چند منٹ ہی برداشت کر پاتا۔ ان چار دنوں میں بار بار میرے جسم کو سگریٹوں سے جلایا جاتا رہا۔ لوہے کے سریے کو آگ میں گرم کر کے میری پنڈلیوں کو داغا جاتا جس کے نشان ابھی تک موجود ہیں۔ میری رانوں پر رولر پھیرا جاتا جس کے باعث میری چیخوں سے سارا تھانہ گونج اٹھتا۔ لیکن مجھ پر تشدد کرنے والے میری چیخ وپکار سے محظوظ ہوتے اور ان کا ایک ہی مطالبہ ہوتا کہ میں اپنی جاں بخشی چاہتا ہوں تو انہیں لکھ کر دوں کہ اپنی بیٹی کے اغوا کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ لیکن اس قدر مار کھانے کے بعد بھی میں یہ الزام قبول نہ کر سکا۔ یارو موچی مجھے کہتا تھا کہ ''پولیس کے تشدد کو سب سے زیادہ چور برداشت کرتا ہے، کیونکہ وہ مار کھانے کا عادی ہوتا ہے۔ لیکن جتنا تشدد تم پر ہوا ہے، اگر مجھ پر ہوتا تو شاید میں بھی برداشت نہ کر پاتا۔'' دراصل یارو موچی اصل بات سے واقف نہیں تھا کہ مجھ پر یہ تشدد کیوں ہو رہا تھا۔ بیٹی کے اغوا کا الزام تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصل جرم تو جماعت احمدیہ سے میری بغاوت تھی۔ میں چونکہ اصل معاملے سے بخوبی واقف تھا، اسی لئے پولیس کا ہر ستم میرا حوصلہ بڑھاتا رہا اور میں اپنے مؤقف میں مزید پختہ ہوتا چلا گیا۔ جماعت احمدیہ کے خلاف میرے دل میں نفرت بڑھتی رہی۔ اس دوران میری تذلیل کا بھی خوب انتظام کیا گیا۔ چناب نگر کے مختلف گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں سمیت تھانہ چناب نگر آتے، مجھے حوالات میں بے یارو مددگار پڑا دیکھ کر ہنستے مسکراتے، مجھ پر آوازے کستے، میرا تمسخر اُڑاتے اور مجھ پر باقاعدہ لعنت بھیج کر واپس چلے جاتے۔ کچھ ''خیر خواہ'' مجھے واپس لوٹ آنے اور ایک اطاعت گزار احمدی بن کر زندگی گزارنے کا ''مشورہ'' بھی دیتے۔ یہ ساری صورتحال میرے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی کیونکہ میرا تعلق ایک انتہائی بااثر قادیانی گھرانے سے تھا۔ میرے گھرانے کے اثر و رسوخ کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ایک مثال ہی کافی ہے کہ 1988ء میں میرے بڑے بھائی محمد رفیع کی جھنگ میں جوتوں کی دکان ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے جوتے رکھنے والے شوکیس کے باہر شیشے پر کلمہ طیبہ کا سٹکر لگا رکھا تھا۔ چونکہ امتناع قادیانیت آرڈیننس 1984ء کے تحت یہ قانوناً جرم ہے اس لئے کسی مقامی مسلمان کی شکایت پر ایک مجسٹریٹ نے ہماری دکان پر چھاپہ مارا۔ اس ''گستاخی'' پر میرے بڑے بھائی نے اس مجسٹریٹ کو بھرے بازار میں تھپڑ مارے تھے۔ پولیس بھائی کو تھانے لے گئی۔ ڈاکٹر عبدالسلام ان دنوں برطانیہ میں تھے۔ گھر والوں نے ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے وہاں سے ایس پی جھنگ کو فون کیا اور آدھے گھنٹے بعد پولیس میرے بھائی کو عزت واحترام کے ساتھ گھر چھوڑ گئی۔ اس گھرانے کا ایک چشم و چراغ آج بے بسی کے عالم میں تھانہ چناب نگر کی حوالات میں پڑا تھا۔ اپنی اس بے بسی پر اگرچہ میری آنکھیں بھیگ جاتیں، لیکن یہ سوچ کر دل کو اِک گونہ اطمینان بھی ہوتا کہ مجھ پر ہونے والے اس ظلم وتشدد کی وجہ میرا کسی اخلاقی جرم میں مبتلا ہونا نہیں ہے۔ بلکہ مجھے جماعت احمدیہ سے بغاوت اور قادیانیت سے نفرت کے جرم میں اس آزمائش سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ یہی وہ سوچ تھی جو مجھے پولیس کا تشدد برداشت کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ حوالات میں گزرنے والے وہ چار دن انتہائی صبر آزما تھے۔ اس دوران مجھے بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ دیگر حوالاتیوں کی روٹی میں سے جو چند ٹکڑے بچتے، میں انہیں پانی کے ساتھ نگل لیتا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مصیبت کی اس گھڑی میں میرے اپنوں نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا۔ والدین، بہن بھائی، اہلیہ اور سسرال والے مجھے چھوڑ کر جماعت کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ وہ سب میرے حالات سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس سارے معاملے سے لاتعلق رہے۔ انہوں نے پولیس سے کوئی رابطہ کیا نہ تھانے آ کر مجھ سے ملنے کی کوشش کی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں ان کے

لئے مر چکا ہوں۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ مجھ پر بیٹی کے اغوا کا الزام محض ایک فریب تھا۔اصل معاملہ تو کچھ اور تھا،اسی لئے میرے گھر والوں حتیٰ کہ میری بیوی نے بھی میری کیس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ بلکہ اس معاملے سے لاتعلق رہ کر انہوں نے جماعت سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں نے قادیانیت سے تائب ہونے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔صرف جماعت سے عملاً علیحدگی اختیار کی تھی۔لیکن میرا یہ جرم بھی گھر والوں کیلئے قابل قبول تھا نہ جماعت احمدیہ کے لئے۔اسی دوران میرے ایک وکیل دوست سید زید محسن کاظمی ایڈووکیٹ کو میرے حالات کی خبر ہوئی تو انہوں نے میری بازیابی کے لئے عدالتی بیلف کا پروگرام بنایا۔کسی طرح چناب نگر پولیس کو بھی اس کی خبر ہوگئی تو انہوں نے فوری طور میرے خلاف اغوا کا جھوٹا مقدمہ درج کر کے اگلے روز ریمانڈ کے لئے مجھے ایڈیشنل سیشن جج چنیوٹ عقیل نذیر کی عدالت میں پیش کر دیا۔میری اس وقت یہ حالت تھی کہ مجھ سے ٹھیک طرح سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔میرے ساتھ آنے والے دو پولیس اہلکاروں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔جج صاحب نے میری طرف دیکھا اور مجھ سے کچھ پوچھا۔میں چند ثانیے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک عجیب سی حرکت کی۔میری اس حرکت پر جہاں جج صاحب کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے،وہیں مجھے عدالت لانے والے سب انسپکٹر اور دو سپاہیوں کے رنگ بھی فق ہو گئے اور میرے پیچھے کھڑے سب انسپکٹر نے بھری عدالت میں اوئے اوئے کرتے ہوئے میرے گدّی پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

جب مجھے ایڈیشنل سیشن جج چنیوٹ کی عدالت میں پیش کرنے کے لئے لیجایا جا رہا تھا تو میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ میں عدالت میں اپنی بے گناہی کیسے ثابت کروں گا۔پولیس کا مجھ پر سخت دباؤ تھا کہ میں عدالت میں پولیس تشدد کے متعلق یا پولیس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہوں۔ایس ایچ او تھانہ چناب نگر نے عدالت لے جانے کے لئے مجھے ڈبل ہتھکڑی لگوائی اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ ''یاد رکھنا کہ اگر تم نے ہمارے خلاف ایک لفظ بھی بولا تو واپس ہمارے پاس ہی آنا ہے''۔پولیس کے بہیمانہ تشدد نے میرا دماغ اس قدر ماؤف کر دیا تھا کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دنیا کو کیسے بتاؤں کہ ایک باپ اپنی ہی بیٹی کو کیسے اغوا کر سکتا ہے۔اسی اُدھیر بن میں مجھے عدالت کے کٹہرے میں پہنچا دیا گیا۔میں جج صاحب کے سامنے کھڑا تھا اور وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔اچانک نجانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے یکدم نیچے سے اپنے آپ کو برہنہ کر دیا۔میری اس حرکت پر فوری طور پر دو ردِعمل ظاہر ہوئے۔پہلا یہ کہ جج صاحب کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔دوسرا میرے پیچھے کھڑے سب انسپکٹر کا میری گدّی پر زوردار تھپڑ پڑا۔لیکن جیسے ہی جج صاحب کی نظر میرے نچلے حصے پر جلے ہوئے زخموں پر پڑی تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔انہوں نے ایک کڑی نظر سے مجھے لانے والے پولیس اہلکاروں کی طرف دیکھا تو ان کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔اب صورتحال یہ تھی کہ کمرہ عدالت پہ سکوت طاری تھا۔جج صاحب خاموش بیٹھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔میرا سر جھکا ہوا تھا۔آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔لب کانپ رہے تھے۔میں بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن لفظ میری زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جج صاحب نے میری دلجوئی کے لئے چند ہمدردانہ جملے کہے اور پھر مجھے کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنا مؤقف کھل کر عدالت کے سامنے بیان کرنے کا حکم دیا۔اس پر میں نے جج صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ''سرکار! میری سمجھ کے مطابق اگر کوئی باپ اپنی ہی بیٹی

کے اغوا کا ڈرامہ رچائے تو اس کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں۔پہلی یہ کہ وہ اس ڈرامے سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔دوسری یہ کہ اگر کسی کی اپنی بیوی یا سسرال والوں سے کوئی ناچاقی ہوتو وہ انہیں اذیت دینے کے لئے ایسی قبیح حرکت کرتا ہے۔تیسری یہ کہ بعض لوگ اپنے دشمنوں کو جھوٹے مقدمے میں پھنسانے کے لئے بھی اس طرح کے ڈرامے رچاتے ہیں۔ لیکن میرے کیس میں یہ تینوں باتیں دکھائی نہیں دیتیں۔میں اس ڈرامے سے کوئی ذاتی مفادتو کیا حاصل کرتا،اُلٹا اغوا کاروں نے مجھ سے 20لاکھ روپے تاوان لیااور یہ رقم بھی میں نے اِدھراُدھر سے قرض لے کر پوری کی۔میں ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کررہا ہوں۔میری اپنی بیوی سے کوئی ناچاقی ہے نہ سسرال والوں سے کوئی جھگڑا۔تیسری بات یہ کہ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے،نہ ہی میرا ایسا کوئی مخالف ہے جسے جھوٹے مقدمے میں پھنسانے کے لئے میں ایسی گھٹیا حرکت کروں۔'' جج صاحب نے میری بات اطمینان سے سنی اور پھر پولیس کی سرزنش کرتے ہوئے فوری طور پر میری باعزت رہائی کا حکم دے دیا۔لیکن رہائی کے بعد بھی جماعت نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔مختلف ذرائع سے ملنے والی دھمکیوں کا سلسلہ تو جاری تھا ہی،اس کے علاوہ بھی جماعت نے میرا حقہ پانی بند کرنے کی ہرممکن کوشش کی۔میری اہلیہ تو اسی وقت مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی تھی جب پولیس نے مجھے بیٹی کے اغوا کے الزام میں گرفتار کیا۔میں نے دوبارہ چناب نگر میں رہائش اختیار کرنے کی کوشش کی تو جماعت کی طرف سے حکم جاری کیا گیا کہ کوئی بھی شخص مجھے اپنا گھر کرایے پر نہ دے۔لہٰذا مجھے ایک مضافاتی آبادی میں رہائش اختیار کرنی پڑی۔20لاکھ روپے تاوان کی ادائیگی کے بعد گنے کی ٹھیکیداری تو کہیں پیچھے رہ گئی تھی بلکہ اب تو اس بھاری رقم کی واپسی ہی میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔دوسری جانب پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔انہی دنوں میرے ایک غمگسار قادیانی دوست رفیق جٹ نے مجھے مظفرآباد میں نیلم جہلم پراجیکٹ کے بارے میں بتایا کہ اگر میں وہاں کوشش کروں تو مجھے کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل سکتی ہے۔میں نے رفیق جٹ کے مشورے پر عمل کیا تو مجھے وہاں باورچی کی نوکری مل گئی۔وہاں گزرنے والے چند ماہ قدرے پُرسکون تھے۔لیکن پھر اچانک مجھے وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔اس کی وجہ یہ بنی کہ نیلم جہلم پراجیکٹ کے ہیڈآفس لاہور سے لے کر مظفرآباد میں سائٹ تک غیرملکیوں کے علاوہ جو مقامی لوگ کام کررہے ہیں،ان میں صرف دس فیصد مسلمان ہیں جبکہ 90فیصد قادیانی ہیں۔عام ورکر سے آفیشلز تک ہر جگہ یہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ابتداء میں تو انہوں نے میری خوب آؤ بھگت کی لیکن جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ میں جماعت احمدیہ سے بغاوت کے جرم میں آج کل زیرعتاب ہوں تو انہوں نے میرا ایسا ناطقہ بند کیا کہ مجبوراً مجھے وہاں سے نکلنا پڑا۔واپس آکر میں نے دوبارہ رفیق جٹ سے رابطہ کیا۔اس کی چناب نگر میں دودھ دہی کی دکان تھی اور وہ پہلے بھی کئی مواقع پر خاموشی سے میری مدد کرچکا تھا۔ہم نے باہم مل کر کھیتی باڑی کرنے کا فیصلہ کیا۔ہم نے چنیوٹ کے کچھ زمینداروں سے رابطہ کرکے 122ایکڑ زرعی اراضی ٹھیکے پر لی اور کام شروع کردیا۔کچھ مسلمان دوستوں کی مہربانی سے ادھار پر ضروری زرعی آلات خریدے اور پہلی فصل اترتے ہی ادائیگی کا وعدہ کیا۔اس کے علاوہ تاوان والے 20لاکھ روپے کی واپسی کا تقاضا بھی اب بڑھنے لگا تھا۔مجھے اس کی بھی فکر کھائے جارہی تھی۔انہی حالات میں کھیتی باڑی شروع کی اور چاول کی فصل کاشت کی۔اس دوران میرا سابقہ معمول دوبارہ بحال ہو گیا۔مسلمان دوستوں سے تعلق پہلے سے زیادہ بڑھ گیا اور اب میں نے کھلے عام ان کی مساجد میں جانا شروع کردیا۔جب

فصل پک کر تیار ہوئی تو کٹائی کے دوران پہلے میرے والد فوت ہوئے اور پھر تین دن کے وقفے سے بڑے بھائی محمد رفیع بھی انتقال کر گئے۔ اگر چہ وہ لوگ مجھے چھوڑ چکے تھے لیکن باپ اور بھائی کے انتقال پر صدمہ ایک فطری امر تھا۔ وہ چند روز سخت پریشانی میں گزرے۔ اسی دوران رفیق جٹ نے فصل کی کٹائی مکمل کرائی اور تمام فصل غلہ منڈی چنیوٹ میں فروخت کرنے کے بعد خود ہی حساب کتاب کر کے مجھے اطلاع دی کہ ہماری چاول کی پہلی فصل 65 لاکھ روپے کی ہوئی جس میں سے میرے حصے میں 35 لاکھ روپے آئے تھے۔ اس نے مجھے 10 دسمبر 2010ء کو 35 لاکھ روپے کا چیک دیا اور کہا کہ اگلے ایک دو روز میں رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے گی۔ اس چیک کا نمبر A 11697458 تھا اور وہ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ چناب نگر برانچ کا چیک تھا جہاں رفیق جٹ نے اپنا کرنٹ اکاؤنٹ کھلوا رکھا تھا جس کا نمبر 01013064 تھا۔ لیکن رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر نہ ہو سکی۔ دو روز بعد بینک نے تحریری طور پر بتایا کہ مذکورہ اکاؤنٹ میں مطلوبہ رقم نہیں ہے۔ بعد میں مجھے کچھ ذرائع سے پتہ چلا کہ جب جماعت کو میری اور رفیق جٹ کی شراکت داری کا علم ہوا تو جماعتی ذمہ داران نے اسے دفتر طلب کر کے سخت سرزنش کی اور اس کے بعد نہ رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئی اور نہ ہی رفیق جٹ چناب نگر میں دکھائی دیا۔ وہ وہاں سے ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اب اصولاً تو چیک ڈس آنر ہونے پر رفیق جٹ کے خلاف قانونی کارروائی ہونی چاہئے تھی لیکن ایسا نہ ہوا۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ چناب نگر میں قادیانیت سے تائب ہو کر مسلمان ہونے والوں کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے ان پر ڈھائے جانے والے مظالم پر چناب نگر تھانے میں ان کی شنوائی اور دادرسی تو دور کی بات ہے، اُلٹا پولیس انہیں اپنے مخصوص ہتھکنڈوں کے ذریعے واپس قادیانیت کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال ڈی ایس پی سعید اختر قتلہ ہے جس نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی قادیانیوں کے اشارے پر مجھ پر تشدد کرایا۔ اسی طرح جماعت کے مظالم کے خلاف کئی لوگوں کی درخواستیں اب بھی تھانہ چناب نگر میں پڑی ہوئی ہیں لیکن ان پر کوئی عملدرآمد نہیں ہو رہا۔ چیک ڈس آنر ہونے کی وجہ سے صورتحال یہ ہوئی کہ مجھ پر کم از کم بیس پچیس لاکھ روپے کا قرضہ چڑھ گیا اور میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے چناب نگر چھوڑنا پڑا۔

چناب نگر میں جماعتی قیادت سے معمولی سا اختلاف کرنے والوں کا حقہ پانی تو بند کیا ہی جاتا ہے، لیکن جو لوگ قادیانیت پر لعنت بھیج کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں، انہیں ایسے ظالمانہ طریقے سے نمونہ عبرت بنایا جاتا ہے کہ دوبارہ کوئی ایسی جرات نہ کر سکے۔ جبکہ مقامی پولیس ایسے جرائم کی مکمل طور پر پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال 2011ء میں وقوع پذیر ہونے والا ایک واقعہ ہے۔ چناب نگر کے علاقے طاہر آباد کے رہائشی تین لڑکے احمد، ندیم اور حفیظ مسلمان ہو گئے۔ ان کی عمریں 20 سے 25 سال کے لگ بھگ تھیں۔ جماعت نے انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے ''سمجھانے'' کی کافی کوشش کی لیکن یہ تینوں نوجوان اپنے ایمان پر ڈٹے رہے۔ جب جماعت نے دیکھا کہ ان کی کوششیں رائیگاں جا رہی ہیں تو پھر ایک روز نائب صدر دفتر عمومی ڈی ایس پی (ر) حمید اللہ قریشی کے بھائی سابق پولیس انسپکٹر بشیر بلاّ نے ان تینوں کو اپنے ڈیرے پر بلایا اور آخری بار سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب ان تینوں نے قادیانیت کی طرف واپس لوٹنے سے واضح انکار کر دیا تو ان پر پٹرول چھڑک کر تینوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان تینوں نوجوانوں کے ورثاء اپنے بچوں کے اس ظالمانہ قتل سے بخوبی واقف تھے لیکن انہوں

نے قادیانی ہونے کی وجہ سے جماعت احمدیہ سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے یا کسی خوف کے سبب قاتلوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ چند روز بعد اس واقعے کو حادثہ قرار دے کر فائل بند کر دی گئی۔ مقتولین کے ورثاء کی خاموشی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں ''باغی'' نوجوانوں کو زندہ جلائے جانے کا فیصلہ کہیں اور کیا گیا تھا۔ بشیر بلاّ نے تو صرف اس فیصلے پر عملدرآمد کیا تھا۔ چناب نگر میں یہ عام معمول کی بات ہے کہ اگر کسی ''باغی'' کو ٹھکانے لگایا جائے تو اولاً تو اس کے ورثاء کوئی قانونی کارروائی نہیں کرتے۔ اور اگر معاملہ زیادہ بگڑ جائے یا میڈیا پر آ جائے تو پھر پہلے ورثاء کی طرف سے مقدمہ درج کرایا جاتا ہے اور پھر چند روز بعد انہیں کچھ رقم بطور دیت ادا کر کے صلح کر لی جاتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ چناب نگر میں رہنے والے سب لوگ یہ کام اپنی خوشی سے نہیں کرتے، بلکہ کئی مجبوریوں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں اور وہ بہت سے کام اپنی مرضی کے برخلاف اور جماعت کی مرضی کے مطابق کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جماعتی قیادت نے اپنی ''امت'' پر بے شمار چندے عائد کر رکھے ہیں۔ جب میں جامعہ احمدیہ میں زیرِ تعلیم تھا، اس وقت ہر قادیانی سے 25 مختلف مدات میں چندہ لیا جاتا تھا۔ اب تو سنا ہے کہ جب سے مرزا مسرور نے ''خلافت'' سنبھالی ہے، انہوں نے چندے کی کچھ مزید مدات بڑھا دی ہیں۔ اسی طرح جو لوگ چناب نگر میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ انہیں وہاں زمین جائیداد کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ چناب نگر کا تمام رقبہ 99 سالہ لیز پر جماعت احمدیہ کے نام ہے۔ جو قادیانی وہاں اپنا گھر بنانا چاہے، اس سے ایک فارم بھروا کر جماعت اسے سادہ کاغذ کی ایک چٹ پر پلاٹ کا الاٹی نمبر لکھ کر تھما دیتی ہے۔ اس موقعہ پر خریدار سے یہ تحریری ضمانت لی جاتی ہے کہ وہ یہ زمین کسی غیر قادیانی کو کسی بھی صورت فروخت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کسی قادیانی کو بھی فروخت کرنا چاہے تو اس کے لئے بھی پہلے جماعت سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ چونکہ چناب نگر میں کسی کے پاس بھی جائیداد کے مالکانہ حقوق نہیں، اس لئے بغاوت کرنے والوں کے گھر اور جائیداد پر جماعت کا قبضہ عام معمول ہے۔ پھر بغاوت کرنے والوں کو جذباتی طور پر بلیک میل کیا جاتا ہے۔ اگر کسی باغی کے بچے چھوٹے ہوں تو جماعت وہ بچے چھین لیتی ہے۔ اس کی ایک مثال میں خود ہوں۔ میری دو بیٹیاں سابقہ بیوی اپنے ساتھ لے گئی۔ اب جماعت کی طرف سے مجھے ان سے ملنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ اسی طرح ہمارے ایک ساتھی شیخ زبیر انور ہیں جنہوں نے 2002ء میں اسلام قبول کیا۔ اس وقت ان کی اکلوتی بیٹی دو ڈھائی سال کی تھی۔ وہ بچی ان سے چھین لی گئی۔ وہ گزشتہ بارہ سال سے اپنی بیٹی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں لیکن ابھی تک انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ابھی بھی اس سلسلے میں چنیوٹ کی ایک مقامی عدالت میں ان کا کیس چل رہا ہے۔

شیخ زبیر انور کا بھی عجب قصہ ہے۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے کیا خوبصورت اسباب پیدا کئے۔ ایک ملاقات میں وہ مجھے بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق لاہور سے ہے، بعد ازاں چناب نگر منتقل ہو گئے۔ وہ پیدائشی قادیانی تھے اور 38 برس تک قادیانیت سے وابستہ رہے۔ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ شیخ زبیر کا کسی گھریلو مسئلے پر بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ دفتر عمومی کی طرف سے انہیں اس جھگڑے میں ثالثی کا پیغام دیا گیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر دفتر آنے سے انکار کر دیا کہ یہ ان کا گھریلو مسئلہ ہے، جماعت اس میں مداخلت نہ کرے۔ جماعت ان کے اس ''حرفِ انکار'' پر اس قدر تلملائی کہ چند روز بعد کچھ لڑکے زبردستی ان کے گھر میں داخل ہوئے اور انہیں اٹھا کر دفتر عمومی لے آئے۔ اس وقت دفتر عمومی کے انچارج میجر (ر) شاہد سعدی اور نائب صدر

ڈی ایس پی (ر) حمید اللہ قریشی ہوا کرتے تھے۔ دفتر عمومی میں شیخ زبیر پر شدید تشدد ہوا اور انہیں وہاں چند روز تک محبوس رکھا گیا۔ اس دوران ان کے گھر پر قبضہ ہوا۔ اس سلسلے میں ان کی قادیانی بیوی نے جماعت کا بھرپور ساتھ دیا۔ پھر ایک روز انہیں شام کے وقت وہاں سے نکال کر ایک گاڑی میں بٹھایا گیا اور چنیوٹ کے ایک چوک میں یہ کہہ کر اتار دیا گیا کہ دوبارہ چناب نگر کا رخ نہ کرنا۔ شیخ زبیر کے پاس اس وقت صرف تن کے کپڑے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رات کہاں گزاریں۔ اسی اثنا میں پاس سے گزرنے والے کسی مقامی آدمی نے انہیں قریب ہی واقع مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کے مدرسے کی راہ دکھائی۔ وہ وہاں پہنچ گئے۔ اتفاقاً مولانا چنیوٹی ان دنوں چنیوٹ میں ہی قیام پذیر تھے اور اس وقت مدرسے میں موجود تھے۔ شیخ زبیر کی بپتا سننے کے بعد انہوں نے انہیں اپنے مدرسے میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ شیخ زبیر قریباً ڈیڑھ ماہ ان کے مدرسے میں مقیم رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دوران وہ جس بات سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے، وہ یہ تھی کہ مولانا منظور چنیوٹیؒ نے ایک بھی دن ان سے نفرت کا اظہار کیا نہ ہی انہیں قادیانیت چھوڑنے اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، بلکہ وہ جب بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ ان کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ البتہ چونکہ شیخ زبیر پڑھے لکھے آدمی ہیں، اس لئے وہ خود گاہے بہ گاہے مولانا چنیوٹی سے قادیانیت اور اسلام کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے اور مولانا جواب دیتے جاتے۔ شیخ زبیر کا یہ کہنا ہے کہ مولانا منظور چنیوٹیؒ کی صحبت میں گزرنے والے ان چند دنوں نے ہی ان کی کایا پلٹ دی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ جب ان کے مسلمان ہونے کی اطلاع چناب نگر پہنچی تو جماعت نے انہیں پھر نشانے پر رکھ لیا۔ 2002ء، 2008ء اور 2009ء میں ان کے خلاف تین جھوٹے مقدمے درج کرائے گئے جن میں ان کی گرفتاری بھی ہوئی اور وہ مجموعی طور پر پانچ سال جیل میں بھی رہے۔ لیکن ان مظالم کے باوجود وہ ثابت قدم رہے اور ابھی بھی اپنی بیٹی کے حصول کے لئے عدالتوں میں دھکے کھا رہے ہیں۔ بچے چھیننے کے بعد باغیوں کے خلاف جو دوسرا بڑا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر کسی کی جوان بیٹیاں شادی شدہ ہوں تو باپ کے مسلمان ہونے کی صورت میں بیٹیوں کو طلاقیں دلوا دی جاتی ہیں۔ بلاشبہ یہ کسی باپ کے لئے بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قادیانی کمیونٹی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کا معاشی و سماجی بائیکاٹ کیا جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کے کئی تکلیف دہ مسائل بھی بے شمار قادیانیوں کے مسلمان ہونے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

چناب نگر میں جماعت احمدیہ نے ریاست کے اندر ریاست قائم کر رکھی ہے۔ وہاں ان کا اپنا پولیس اور عدلیہ کا متوازی نظام ہے۔ دفتر امور عامہ تھانے اور دفتر عمومی پولیس چوکی کا درجہ رکھتے ہیں جہاں باقاعدہ ٹارچر سیل بنے ہوئے ہیں۔ ان کا عدالتی نظام ایسے ہی ہے، جس طرح ملک بھر میں عدالتی نظام کے چار درجے ہیں، سول کورٹ، سیشن کورٹ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ۔ بالکل اسی طرح چناب نگر میں جماعت احمدیہ کے عدالتی نظام کے بھی چار درجے ہیں۔ قادیانی وکلاء وہاں پیش ہو کر بحث میں حصہ لیتے ہیں۔ قادیانی ججز چھٹی کے روز وہاں فرائض انجام دیتے ہیں اور آخری اپیل مرزا مسرور کے پاس کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چناب نگر میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ قادیانیوں کی ایک قابل ذکر تعداد ایسی ہے جو وہاں سے نکلنا چاہتی ہے لیکن ان کی معاشی و سماجی مجبوریاں آڑے آ رہی ہیں۔ میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج حکومت چناب نگر کو اوپن سٹی قرار دیتے ہوئے وہاں کے مکینوں کو جائیداد کے مالکانہ

حقوق اور جان و مال کا تحفظ فراہم کرے تو 25 فیصد قادیانی ابھی مسلمان ہو جائیں گے۔

جماعت احمدیہ کی قیادت کی علمی قابلیت کا یہ حال ہے کہ 1999ء میں جب میری شادی ہوئی تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرا نکاح مرزا مسرور پڑھائیں جو اس وقت ابھی خلیفہ نہیں بنے تھے بلکہ ناظر اعلیٰ و امیر مقامی جماعت احمدیہ پاکستان تھے۔ میں نے جب ان کے پاس حاضر ہو کر نکاح پڑھانے کی درخواست کی تو وہ پریشان ہو گئے۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولے، ''آپ میری انگلی پکڑو اور مجھے جامعہ احمدیہ داخل کروا آؤ۔ پانچ سالہ کورس مکمل کرنے کے بعد میں آپ کا نکاح پڑھانے کے قابل ہو جاؤں گا۔

رفیق جٹ کا دیا ہوا چیک ڈس آنر ہونے کے بعد جب میں چناب نگر سے نکلا تو میری بڑی بیٹی روتی ہوئی میری ٹانگوں سے چمٹ گئی اور کہنے لگی ''پاپا میں نے آپ کے ساتھ جانا ہے''۔ اس وقت مجھ پر کیا گزری، یہ درد اور کرب وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے اللہ نے بیٹی جیسی رحمت سے نوازا ہوا ہے۔ چناب نگر سے نکل کر لاہور آیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے چھوٹی موٹی مزدوری شروع کر دی۔ ایسے ہی ایک روز اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ابھی مجھے موت آ جائے تو میرا جنازہ کون پڑھائے گا، کہ جماعت احمدیہ تو مجھے منہ نہیں لگائے گی کیونکہ ان کے نزدیک میں باغی ہوں۔ اور قادیانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو ویسے ہی مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ تو بالکل خدا ہی ملا نہ وصال صنم والی صورتحال ہو گی۔ یہ خیال میرے ذہن پر اس بُری طرح سوار ہوا کہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ میرا انجام کیا ہو گا۔ 23 فروری 2014ء کو لاہور کے ایک عالم سید انیس شاہ صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ دو روز بعد 25 فروری کی شام نماز عشاء کے بعد مجھے انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کے رہنما مولانا قاری رفیق وجھوی صاحب کے پاس لے گئے۔ قاری صاحب سے ہونے والی میری ملاقات چار گھنٹوں پر محیط تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میں سابقہ حالات کی وجہ سے سخت خوفزدہ تھا۔ ہر وقت یہی ڈر رہتا کہ کسی بھی وقت کوئی اندھی گولی مجھے چاٹ سکتی ہے، راہ چلتے پیچھے سے آنے والی کوئی گاڑی مجھے کچل سکتی ہے، کسی بھی وقت میری زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے۔ قاری صاحب نے سب سے پہلے تو مجھے حوصلہ دیا اور کہا کہ اگر آپ اسلام کی حقانیت پر ایمان لا چکے ہیں تو پھر آپ کو کسی سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ مسلمان اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اتفاقاً اگلے ہی روز 26 فروری کو ایوان اقبال لاہور میں ''فتح مباہلہ کانفرنس'' منعقد ہو رہی تھی۔ قاری رفیق صاحب کہنے لگے کہ کل کانفرنس ہو رہی ہے۔ یہ اللہ نے آپ کو موقعہ دیا ہے کہ آپ اس کانفرنس میں شریک ہو کر اسلام قبول کریں، آپ کے قبول اسلام کے ہزاروں لوگ گواہ ہونگے۔ لہٰذا اگلے روز میں کانفرنس میں شریک ہوا اور اللہ کے فضل و کرم سے مولانا عبدالحفیظ مکی، ڈاکٹر احمد علی سراج، مولانا الیاس چنیوٹی، جسٹس (ر) ڈاکٹر علامہ خالد محمود، سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ جسٹس (ر) خواجہ شریف اور دیگر شخصیات کی موجودگی میں اردن سے آئے ہوئے اسلامی سکالر امجد عبدالرحمٰن السقلاوی نے مجھے کلمہ پڑھایا۔

قاری رفیق صاحب نے مجھے باعزت طریقے سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے لئے حوصلہ بھی دیا اور خود ہی رشتہ تلاش کر کے ایک مسلمان خاتون سے میری شادی بھی کرائی۔ اس سلسلے میں، میں دینی جماعتوں خصوصاً تحفظ ختم نبوت کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کے ذمہ داران سے بصد احترام یہ گزارش کروں گا کہ وہ قادیانیت چھوڑ کر مسلمان ہونے

والوں کو سنبھالنے کے لئے کوئی ٹھوس منصوبہ تشکیل دیں۔انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی گزارنے میں مدد دیں۔جماعت احمدیہ کی طرف سے ہونے والے جھوٹے مقدمات سے نمٹنے کیلئے قانونی معاونت فراہم کریں۔ان کی دلجوئی کریں۔جب کہ یہاں صورتحال یہ ہے کہ ہمارے ساتھی شیخ زبیر جب ایک جھوٹے مقدمے میں ڈسٹرکٹ جیل جھنگ میں قید تھے تو ان کا کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔گھر والے پہلے ہی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ایک خدا ترس جیل ملازم نے جب ان کی بپتا سنی تو ان کے لئے وکیل کا بندوبست کیا،تب ان کی رہائی ممکن ہوئی۔

میرے مسلمان ہونے کے بعد بھی جماعت احمدیہ نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔26 مئی 2014ء کی دوپہر لاہور کی لبرٹی مارکیٹ کے قریب کچھ نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے مجھ پر حملہ کر کے شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔مختلف ٹیلی فون نمبروں سے دھمکی آمیز کالیں آنے کا سلسلہ تو معمول میں شامل ہے۔اس کے علاوہ گاہے بہ گاہے ''بہترین مستقبل'' کا لالچ بھی دیا جاتا ہے جس کی تازہ ترین مثال یہ ہے،ابھی جب میرا انٹرویو ''امت'' میں چھپنا شروع ہوا تو چند روز قبل جماعت نے میرے بہنوئی کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے یہ پیشکش کی گئی کہ اگر میں واپس لوٹ آؤں اور یہ بیان دے دوں کہ ''امت'' میں چھپنے والا میرا انٹرویو خود ساختہ ہے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں،تو جماعت نہ صرف مجھے مالی وسائل فراہم کرے گی بلکہ مجھے اپنی سابقہ بیوی اور بیٹیوں کے ہمراہ بیرون ملک سیٹل بھی کرائے گی۔

میں ''امت'' کے توسط سے جماعت احمدیہ کی قیادت کو یہ چیلنج کرتا ہوں کہ میں نے اس انٹرویو میں جو کچھ بیان کیا ہے،وہ میری کہی ہوئی کسی ایک بات پر مجھے جھوٹا ثابت کر دیں۔میرا یہ چیلنج مرزا مسرور سے سلیم الدین تک،سب کے لئے ہے۔وہ کھلے میدان میں آئیں،میرے ساتھ مباہلہ کریں اور مجھے جھوٹا ثابت کریں۔مجھے بخوبی علم ہے کہ جماعت احمدیہ میرے بارے میں کوئی نیک جذبات نہیں رکھتی۔میرے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔اس لئے میں ''امت'' کے توسط سے یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوا یا مجھے کوئی نقصان پہنچا تو اس کے ذمہ دار مرزا مسرور،ناظر اعلیٰ مرزا خورشید،ناظر امور عامہ سلیم الدین،اللہ بخش صادق اور دیگر مرکزی ذمہ داران ہونگے۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوا تو میرے سرپرست قاری رفیق صاحب ہیں،وہی میرا مقدمہ لڑیں گے۔ان کے علاوہ میرا کوئی سرپرست نہیں ہے۔

میں جب یہ سوچتا ہوں کہ میں نے سیکڑوں مسلمانوں کو اسلام سے کفر کی طرف دھکیلا تو طبیعت بہت بے چین ہو جاتی ہے لیکن میں اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔میرا عزم ہے کہ میں بہت جلد ان تمام علاقوں کا دورہ کروں گا جہاں بطور مربی کام کرتا رہا اور وہاں لوگوں کو یہ بتاؤں گا کہ حضور ﷺ کے بعد اللہ نے نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔اب جو بھی نبوت کا دعویدار سامنے آئے گا وہ کذاب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور مرزا غلام احمد قادیانی بھی ان میں سے ایک ہے۔میری تمام مسلمانوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ مجھے استقامت دے اور جلد از جلد حرمین شریفین کی زیارت نصیب فرمائے تا کہ میں بیت اللہ شریف اور روضہ رسول ﷺ پر حاضر ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکوں۔